R. No. 2186/57 REGD NO. L922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

فون نمبر ۷۹
سالانہ قیمت ۵ روپے
فی کاپی پندرہ پیسے

تاریخ اشاعت
۱-۸-۱۵-۲۲

جلد ۲۷ - شمارہ ۲۶	ایڈیٹر: آل احمد سرور	۸ جولائی ۱۹۶۸ء

اداریہ

یونی ورسٹی کے اردو اساتذہ کی تیسری کانفرنس

یونی ورسٹی کے اردو اساتذہ کی پہلی کانفرنس جنوری ۱۹۶۶ء میں دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کے اہتمام میں ہوئی تھی۔ دوسری کانفرنس جون ۱۹۶۷ء میں جموں و کشمیر یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کی دعوت پر سری نگر میں ہوئی۔ اب تیسری کانفرنس علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کی دعوت پر ۲۰، ۲۱، ۲۲ اکتوبر کو علی گڑھ میں ہوگی۔

یونی ورسٹی کے اردو کے استادوں کی انجمن جس کی تیسری کانفرنس ہونے والی ہے ایک علمی ادارہ ہے جس کا مقصد یونی ورسٹیوں میں اردو کی تعلیم کے معیار کی نگہداشت کرنا، نصاب کے مسائل پر غور کرنا، اردو میں ریسرچ کے سرمائے کا جائزہ لینا اور آئندہ کے لیے خطوط تجویز کرنا، اردو میں تنقید کے تمام میلانات کو ذہن میں رکھنا اور تنقید کے ایک اعلیٰ معیار پر اصرار کرنا ہے۔ اس کے ساتھ یہ درس و تدریس کے مسائل اور اساتذہ کے ان حقوق کی نگہداشت بھی ضروری سمجھتی ہے جو ان کے پیشے سے متعلق ہیں۔ پہلی کانفرنس کی مکمل روداد شائع ہو چکی ہے۔ دوسری کانفرنس کی روداد بھی عنقریب شائع ہو جائے گی۔

اس کانفرنس میں نصاب کے مسائل، تحقیق کے مسائل، تنقید کے مسائل، تدریس کے مسائل کے علاوہ ایک خاص اجلاس اردو ذریعۂ تعلیم کے موضوع پر بھی ہوگا۔ تعلیمی کمیشن کی رپورٹ اور وائس چانسلروں کی کانفرنس نے اصولاً یہ تسلیم کر لیا ہے کہ تمام علاقائی زبانوں میں پانچ سے دس سال کے اندر بی اے کی منزل پر تعلیم کا انتظام کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں یونی ورسٹی کی منزل پر اردو کے ذریعے سے بی اے اور بی ایس سی اور بی کام کی تعلیم دینے کا سوال بھی اٹھتا ہے۔ گو عثمانیہ یونی ورسٹی اردو کے ذریعہ سے اعلیٰ تعلیم کا کامیاب تجربہ کر چکی ہے اور اردو میں جدید علوم کی کچھ معیاری کتابوں کے تراجم بھی موجود ہیں، مگر ظاہر ہے کہ ہمیں یونی ورسٹی کی تعلیم سے پہلے ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی بنیاد کو مضبوط اور مستحکم بنانا ہے۔ صورت یہ ہے کہ ابتدائی منزل پر اردو میں تعلیم گو اتنے بڑے پیمانے پر نہیں دی جاتی جتنے بڑے پیمانے پر اس کی ضرورت ہے اور نہ کتابوں اور استادوں کی فراہمی قابل اطمینان ہے۔ مگر یہ تعلیم دی تو جا رہی ہے اسے صرف حسب ضرورت پھیلانا اور اس کے معیار کو تسلی بخش بنانا ہے۔ مگر ثانوی منزل پر ضرورت کے مطابق اردو کے ذریعے سے تعلیم کا انتظام صرف چند ریاستوں میں ہے اور وہاں بھی ناکافی ہے۔ یہاں مناسب کتابوں اور اساتذہ کی فراہمی کا مسئلہ اور زیادہ اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔ ان حالات میں ایک نظریہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ پہلے ابتدائی اور ثانوی منزل پر حسب ضرورت اور مناسب معیار کے مطابق اردو میں تعلیم کا انتظام ہر جگہ ہو جائے، پھر یونی ورسٹی کی منزل پر اردو کے ذریعے سے تعلیم کا مسئلہ اٹھانا چاہیے۔ یہ بات بظاہر منطقی معلوم ہوتی ہے مگر قوموں کی زندگی میں منطق کی اتنی اہمیت نہیں جتنی وقت اور ضرورت کی ہے۔ اس لئے ہمارے نزدیک یونی ورسٹی کی منزل پر اردو کے ذریعے سے تعلیم کے لئے فوری اقدامات کرنے چاہئیں اور اگر یہ انتظامات ہو جائیں گے تو ان سے ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا معیار بھی بہتر ہوگا۔ گویا عام طور پر نیچے سے اوپر جانا چاہئے مگر خاص حالات میں اوپر سے نیچے جانا بھی ٹھیک ہوتا ہے۔ یونی ورسٹی کی منزل پر اعلیٰ تعلیم ایک فوری حکم کے ذریعے سے نہیں دی جا سکتی۔ اس کے لئے خاص تیاری کی ضرورت ہوگی۔ اس تیاری کے لئے عرصے کی ضرورت نہیں پانچ سے لے کر دس سال تک کی مدت کافی ہوگی۔ ہمیں سب سے پہلے ہر مضمون کی معیاری کتابیں تیار کرنا ہیں۔ یہاں صرف تراجم سے کام نہ چلے گا۔ طلبہ کی نفسیات اور ضروریات اور معیار کو ملحوظ رکھتے ہوئے کتابیں لکھوانی بھی ہوں گی۔ پھر اصطلاحات کے سلسلے میں دانش مندی سے کام لینا ہوگا۔ ہم نہ تو آنکھ بند کر کے تمام اصطلاحیں مغرب سے لے سکتے ہیں، نہ ساری اصطلاحات اس طرح گڑھ سکتے ہیں جس طرح ہندی والے

رہے ہیں۔ ہمیں پہلے تو یہ دیکھنا ہوگا کہ خالص فنی اصطلاحیں کس حد تک ہم اپنی زبان میں معمولی تصرف کے بعد داخل کر سکتے ہیں اور اپنی مروجہ اصطلاحوں میں سے کتنی ہم فنی [illegible] بے تکلف برت سکتے ہیں۔ پھر یہ مسئلہ بھی پیدا ہوگا کہ اساتذہ کی موجودہ کھیپ کو جو اردو سے جذباتی تعلق رکھتے ہوئے بھی اس سے زیادہ واقف نہیں ہے اور اس واقفیت کے لئے تھوڑی سی تکلیف بھی گوارا نہیں کرنی چاہتی، کس طرح ساتھ لیا جائے اور کس طرح اس کے درس کے معیار کو بھی گرنے نہ دیا جائے۔ اسی لئے کانفرنس میں ذریعہ تعلیم کا شعبہ خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ ہمارا ایمان یہ ہے کہ اگر یونیورسٹی کی منزل پر خاص خاص یونیورسٹیوں میں اور کچھ کالجوں میں ہم اردو کے ذریعہ سے تعلیم دیں اور یہ اردو اردوئے معلی نہ ہو بلکہ آج کی عام فہم اردو ہو، تو جو طلبہ اس طرح فارغ التحصیل ہو کر نکلیں گے وہ ثانوی تعلیم اور ابتدائی تعلیم کی منزل پر بھی معیار کو بہتر بنانے میں معاون ہوں گے۔

نصاب کا مسئلہ بھی خاص اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ اردو کی معیاری کتابیں روز بروز نوادر بنتی جا رہی ہیں ہمارے علمی و ادبی ادارے اتنے سرمایہ دار نہیں کہ ان کتابوں کی دوبارہ اشاعت اور بہتر کتابت و طباعت کے لئے روپیہ لگا سکیں۔ حکومت کو اس کام سے ہمدردی نہیں ہے۔ اچھے انتخابات کے لئے بھی اچھی خاصی جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ کچھ یونیورسٹیاں اپنے طور پر کچھ انتخابات تیار کرائی ہیں مگر ان میں یہ خیال نہیں رکھا جاتا کہ وہ جامع ہوں اور ہر جگہ کام آ سکیں۔ اس لئے اساتذہ کی انجمن بی اے اور ایم اے کے لئے اور ابتدائی اردو کے لئے ایسے انتخابات تیار کرا سکتی ہے جو وہ مختلف یونیورسٹیوں کی مدد سے شائع کرے اور انھیں سبھی یونیورسٹیاں استعمال کر سکیں۔

اردو کے استادوں کا کام دوسرے مضامین کے استادوں سے زیادہ مشکل ہے۔ انھیں نہ صرف اپنے پیشے کے فرائض ایمانداری سے انجام دینے ہیں، بلکہ ان حالات کا بھی مقابلہ کرنا ہے جو اردو کی طرف سے ریاستی حکومتوں کی بے اعتنائی کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ یعنی انھیں زبان و ادب کی حفاظت کے لئے بھی فضا ہموار کرنا ہے۔ پھر ان کو درس و تدریس کے مسائل اور طلبہ کی نفسیات کو بھی ذہن میں رکھنا ہے۔ ان وجوہات سے اساتذہ کی انجمن کا کام نہایت اہم ہے اور ہمیں یقین ہے کہ علی گڑھ کی کانفرنس ان تمام توقعات کو پورا کر سکے گی جو اس سے بجا طور پر وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ آج ہماری یونیورسٹیوں میں جو کام ہو رہا ہے کچھ حلقے اس پر اعتراض کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اس کام کو اور بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ مگر آج بھی اس کی افادیت اور معنویت میں کلام نہیں۔ یونیورسٹیوں کے اساتذہ کے ذریعہ سے ہی اردو میں تحقیق و تنقید کے معیار کو عالمی معیاروں تک لایا جا سکتا ہے۔ انھیں کے ذریعہ سے طلبہ میں زبان و ادب سے وہ لگن پیدا کی جا سکتی ہے جو سائنس اور صنعت و حرفت کے دور میں صالح سیرت و شخصیت کے لیے ضروری ہے۔

پاکستان میں دو نئی زبانیں ایجاد ہوں گی

نئی دہلی، یکم جولائی۔ حکومت پاکستان نے دو نئی زبانیں ایجاد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ایک کا نام پاکستانی بنگلہ ہوگا۔ اور دوسری کا پاکستانی اردو۔ ان زبانوں کو ملک کے مختلف حصوں میں رہنے والے پاکستانی سمجھ سکیں گے۔ یہ اعلان جب پاکستان کی قومی اسمبلی میں وزیر زراعت و تعمیرات نے کیا تو ایوان کے ہر حصے سے اس کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ (قومی آواز)

امجد نجمی

ساحل

رات کا پچھلا پہر
پی کے خوابِ آور دوا
نیند سے بیدار میں
کی نظر سوئے فلک
ہے ابھی گرمِ سفر
جگمگاتے ہیں ابھی
جب نمودِ صبح سے
لیکے پیغامِ رحیل
ڈولتی ہے جو مری
جا کے ملتا ہے اسے

ایک دم خاموش ہے
ہر کوئی بے ہوش ہے
جب اچانک ہو گیا
سوچ میں پھر کھو گیا
زندگی کا کارواں
چاند تارے کہکشاں
ان کی شام آ جائے گی
ان کے نام آ جائے گی
کشتیٔ عمرِ رواں
دیکھئے ساحل کہاں!

اترپردیش غالب کمیٹی کے زیر اہتمام کلچرل وفد کھٹمنڈو جائے گا

لکھنؤ، اترپردیش صد سالہ جشن غالب کمیٹی کے زیر اہتمام ایک ثقافتی وفد جولائی کے نصف میں نیپال جائے گا۔ یہ وفد سرکردہ ادیبوں، شاعروں، موسیقاروں اور کمیٹی کے بعض ممبروں پر مشتمل ہوگا۔ وفد اس ہمالیائی سلطنت میں تقریباً دو ہفتہ قیام کرے گا۔ وفد اترپردیش صد سالہ جشن غالب کمیٹی کے جنرل سکریٹری جناب پی۔ اسی سیٹھی کی قیادت میں جائے گا۔

(قومی آواز)

اردو کے نوجوان صحافی مظفر شاہ کا انتقال

نئی دہلی، ۲۹ر جون کی شام ۷ بجے اردو کے ایک صحافی حکومت ہند کے پبلیکیشنز ڈویژن کے گزیٹڈ افسر مظفر شاہ کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم کی عمر ۴۵ سال تھی۔ ادارہ ہماری زبان پسماندگان کے رنج و غم میں شریک ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن

اردو کا جمہوری حق

لسانی اور تہذیبی مسائل پر گفتگو کرتے وقت یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہندوستان مختلف زبانوں اور مختلف تہذیبوں کا گہوارہ ہے اس لیے یہاں تہذیبی، لسانی یا سیاسی مسائل کا حل اس طرح ممکن نہیں جس طرح انگلستان یا دوسرے یک قومی ملکوں میں ممکن ہے۔ ہندوستان ایک ایسی وحدت ہے جو مختلف کثرتوں سے عبارت ہے اس کی وحدت کثرتوں کی لاش پر نہیں ان کے تعاون سے بنی ہے اور صرف ان کے تعاون ہی سے پنپ سکتی ہے اس لیے کسی ایک زبان کو قومی زبان قرار دینا یا کسی ایک فرقے یا گروہ کی تہذیب کو قومی تہذیب قرار دینا صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ تاریخی اور تہذیبی حقیقت کے خلاف ہے۔ یہاں وحدت - خواہ اسے قومی یک جہتی کا نام دیا جائے یا قومی تہذیب کہا جائے یا قومی زبان کا لقب دیا جائے - جبراً نافذ نہیں کی جا سکتی یہاں کی وحدت وہی ہوگی جو مختلف تہذیبوں اور لسانی گروہوں کے اشتراک سے خوش دلی اور پر خلوص تعاون سے پیدا ہو۔

اس لئے صرف ایک زبان کو قومی زبان قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ جتنی جدید ہندوستانی زبانیں ہیں وہ سب ہماری قومی زبانیں ہیں اور ایک کو دوسری پر فوقیت حاصل نہیں ہے۔

اگر ہم اس بنیادی تصور کو تسلیم کر لیں تو پھر یہ لازم آتا ہے کہ نہ صرف مرکز میں حکومت کا سرکاری کام حسب ضرورت ایک سے زیادہ زبان میں چلانا چاہیے۔ اور تامل، تلگو، ملیالم اور بنگالی وغیرہ زبانوں میں مراسلت کی آزادی متعلقہ ریاستی حکومتوں اور مرکز کے درمیان ہونی چاہیے اور اسی طرح کی دوسری ضروری آسانیاں ملنی چاہئیں بلکہ ہر ریاست میں جہاں یہ صورت حال موجود ہو ایک سے زیادہ زبانوں کو سرکاری زبانیں تسلیم کرنے کے لئے آمادہ ہونا چاہیے۔ ان ریاستوں میں جہاں غالب علاقائی زبان بولنے والوں کے علاوہ دوسری زبان والوں کی خاصی بڑی تعداد ہو وہاں ریاستی حکومت کو پوری فراخ دلی کے ساتھ تعلیم اور انتظام کے شعبوں میں غالب علاقائی زبان کے ساتھ ساتھ دوسری زبان کو بھی جگہ دینی چاہیے اور ثانوی سرکاری زبان تسلیم کرنا چاہیے۔

اس فراخ دلانہ جمہوری رویے کے سلسلے میں دشواریاں کیا ہیں؟ مالی وسائل؟ حکومت کے لئے ایک زبان کے ساتھ ساتھ دوسری زبان میں اپنے دفاتر کے ریکارڈ تیار کرانا اور اس کے لئے مناسب تیاریات کا انتظام بہت بڑا مسئلہ نہیں ہو سکتا خصوصاً اس وقت جب کہ اکثر ریاستوں میں ایسے صاحب استعداد حضرات کثرت سے ملیں گے جو دونوں زبانیں جانتے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ چند لاکھ روپے کا مزید خرچہ اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ ہر ریاست کے لاکھوں انسان یہ محسوس کریں کہ ان کی مادری زبان کے ساتھ انصاف نہیں ہو رہا ہے ان کے تخلیقی جوہر نکھر کر صرف اس لیے سامنے نہ آ سکیں کہ انھیں اپنی مادری زبان کو ذریعہ اظہار بنانے کی سہولت نہ ملی اور وہ جمہور سے کٹ کر رہ جائیں اور اپنے دلوں میں گھٹن، بے زاری اور بے اطمینانی کے جذبات لئے بیٹھے رہیں جن سے نہایت خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ ایسی قوم کیا ترقی کر سکتی ہے جس کے ایک تہائی یا ایک چوتھائی افراد اس کے ترقی کے منصوبوں میں سرگرمی سے حصہ نہ لے سکیں یا غیر مطمئن اور بے زار رہیں۔

دشواری در اصل اخراجات کی نہیں چودھراہٹ کی ہے یہ چودھراہٹ عام ہندی بولنے پڑھنے والا قائم کرنا نہیں چاہتا وہ ایماندار بھی ہے سچا قوم پرست بھی اور انصاف پسند بھی اس کا اس میں کوئی فائدہ نہیں ہے کہ وہ جبراً اپنی زبان کو دوسری زبانوں پر غلبے کے لیے استعمال کرے لیکن وہ برسر اقتدار گروہ جو ہندی کو اپنے اقتدار کا ذریعہ بنانا چاہتا ہے وہ اس کے لئے ہرگز آمادہ نہیں کہ جبر کی جگہ اشتراک کو اور "وحدت" کی جگہ کثرت کے تعاون سے پیدا ہونے والی وحدت کو اختیار کرے وہ دوسری تہذیبوں کو کچل کر اپنی تہذیب اور دوسری زبانوں کو یا تو کچل کر یا زیر کر کے اپنی زبان نافذ کرنا چاہتا ہے وہ ہندی کو انگریزی کی جگہ اقتدار کی زبان بنانا چاہتا ہے۔

ایسے ہی ایک بزرگ کی زبانی ہم نے یہ کلمات فخریہ سنے ہیں کہ "مشہور بنگالی ماہر لسانیات ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی آج ہندی کے راشٹر بھاشا ہونے کی مخالفت کرتے ہیں یقین مانئے ان کی تیسری پشت ہندوستان میں بھیک مانگے گی۔"

لہٰذا اردو کا مسئلہ ہندوستان میں براہ راست صحیح جمہوری قدروں کے مستقبل کے سوال سے وابستہ ہے ایک طرف وہ لوگ ہیں جو فاشزم کے بالواسطہ یا بلا واسطہ علم بردار ہیں اور جبری مرکزیت کے قائل ہیں یہ لوگ محض اردو کے دشمن نہیں زندگی کے تمام ترقی پسند اور صالح قدروں کے دشمن ہیں وہ رواداری، وسعت فکر، فراخ دلی اور آزادی رائے کے بھی مخالف ہیں اور جمہوریت سماجی انصاف مساوات اور سوشلزم کی نعمتوں کے بھی منکر ہیں دوسری طرف وہ لوگ ہیں جن کے نزدیک وحدت اور صحیح وحدت کے لئے ضروری ہے کہ لسانی اور تہذیبی اقلیتیں مطمئن ہوں اور اپنی رضامندی سے قومی ہم آہنگی پیدا کریں جس کے لئے سماجی انصاف لازمی ہے اور اردو بھی اسی سماجی انصاف کی حق دار ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ اردو ۱۹۶۱ء کے انتہائی غیر اطمینان بخش مردم شماری کے اعداد و شمار کے مطابق دو کروڑ اکتیس لاکھ اکیاون ہزار آٹھ سو اٹھارہ ۲۳۱۵۱۸۱۸ ہندوستانیوں کی مادری زبان ہے ان ہندوستانی شہریوں کا مذہب کیا ہے؟ یہ سوال غیر متعلق ہے۔ جب تک اس زبان کے بولنے والے ہندوستانی جمہوریت کے شہری ہیں ان کو پورے لسانی اور تہذیبی

معقول نہ ملنے چاہئیں ان کا مذہب خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو کسی مذہب کے ماننے یا نہ ماننے سے ان کے لسانی حق پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اردو کے بارے میں جو مختلف الجھنیں پیدا کی جاتی ہیں ان میں مرکزی حیثیت دو باتوں کو حاصل ہے ایک یہ کہ اس زبان کا کوئی مخصوص علاقہ نہیں ہے جہاں یہ بات صحیح ہے کہ پورے ملک میں ایسا ایک ضلع بھی نہیں ہے جہاں صرف اردو بولنے والے ہی آباد ہوں اور اردو کے علاوہ کوئی دوسری ہندوستانی زبان نہ بولی جاتی ہو وہاں یہ بات بھی سچ ہے کہ ہندوستان کی کوئی ریاست ایسی نہیں ہے جہاں اردو زبان بولنے اور سمجھنے والے اور اسے مادری زبان ماننے والے معتدبہ تعداد میں موجود نہ ہوں ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے ناقص اعداد و شمار کے اعتبار سے۔ آندھرا میں ۲۵۵۳۷۵۳، بہار میں ۴۱۴۹۲۴۵۔ گجرات میں ۵۹۴۵۳۸، مدھیہ پردیش ۷۷۴۰۹۸۔ مدراس میں ۶۱۵۵۰۳۔ مہاراشٹر میں ۲۰۰۲۵۸۹۔ میسور میں ۱۴۴۳۴۰۳۔ اڑیسہ میں ۱۸۹۲۱۲۔ پنجاب میں ۲۵۵۶۶۰۔ راجستھان میں ۴۶۵۵۰۹۔ اترپردیش میں ۷۸۹۱۰۱۰۔ مغربی بنگال میں ۸۲۷۸۲۲۔ انڈمان میں ۲۴۴۳، ۱۵۳۔ ہماچل پردیش میں ۹۸۱۳، ۷۲۲۔ دہلی میں ۱۵۱۲۵۳ بولنے والے موجود ہیں۔

بعض حضرات نے اس خیال کا بھی اظہار فرمایا ہے کہ اترپردیش اور بہار کے صرف بعض ضلعوں میں اردو بولنے والوں کی زیادہ تعداد ہے لہٰذا صرف ان ضلعوں میں اردو والوں کو چند آسانیاں دے دی جائیں۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے ناقص اعداد و شمار کے مطابق بھی اردو اترپردیش کے سبھی ۵۴ اضلاع میں اور بہار کے سبھی ۱۸ اضلاع میں بولی جاتی ہے اور اردو بولنے والوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے لہٰذا مسئلہ محض چند ضلعوں کا نہیں بلکہ پوری ریاستوں کا ہے۔

۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار کو ناقص اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ اول تو آسام جموں اور کشمیر اور پنجاب کی لسانی صورت حال کے بارے میں اعداد و شمار کی تفصیل اس میں فراہم نہیں کی گئی ہے۔ دوسرے اس میں اردو اور ہندی کے علاوہ ہندوستانی کو بھی ایک الگ زبان تسلیم کر لیا گیا ہے جب کہ ہندوستان کا دستور اسے تسلیم نہیں کرتا تیسرے خود مردم شماری کے اعداد و شمار کے کرتا دھرتاؤں نے ہندی اور اردو کے اعداد و شمار کو جگہ جگہ غلط ملط کر کے ایک ہی جگہ شامل کر لیا ہے اس کے علاوہ اردو بولنے طبقے میں یہ شکایت عام ہے کہ جن لوگوں نے اپنی مادری زبان اردو لکھوائی ان کے ناموں کے آگے بھی صحیح اندراج نہیں کیا گیا۔

مسئلے کو الجھانے کی غرض سے ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ اردو مغل دربار کی زبان تھی اور مغلوں نے اپنی انتظامی آسانیوں کی غرض سے اسے عوام پر لادا اور درحقیقت یہ عوام کی زبان نہیں رہی۔ اول یہ اعتراض صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو تاریخ ادب سے صحیح واقفیت نہیں رکھتے حقیقت یہ ہے کہ اردو آخری چند برسوں کو چھوڑ کر کبھی مغل دربار کی سرکاری زبان نہیں رہی دوسرے لسانی ارتقا کی اس شکل کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ عہد وسطیٰ میں جاگیرداری نظام نے جب اپنے طور پر تجارتی اور انتظامی مرکز یعنی شہر اور زراعتی جاگیر یعنی دیہات کی تقسیم روا رکھی تو زبان و ادب اور تہذیب کی سطح پر بھی یہ تقسیم ابھری۔ شمالی ہند کے دیہاتوں کا ادب خصوصاً شاعری بولیوں میں یعنی اودھی اور برج بھاشا کی شکل میں سامنے آئی اور شہروں میں بولیوں کی جگہ نئی مخلوط اور مشترک زبان کھڑی بولی نے ایک نیا ادب لے لیا جس کی ایک شکل اردو ہے۔ دوسری ہندی۔ اور یہ بات فراموش کرنے کی نہیں کہ ہندی نے کھڑی بولی کو اپنانے کے بجائے مدتوں برج بھاشا اور اودھی ہی کو ذریعہ اظہار مانا جب کہ اردو نے کھڑی بولی ہی پر ساری توجہ صرف کر دی دوسرے لفظوں میں دیہات کے کسانوں کا ذریعہ اظہار بولیاں اور خصوصاً برج اور اودھی تھیں اور شہروں کے عوام کا ذریعہ اظہار کھڑی بولی جس کا نکھرا ادب اردو ہے اس طرح اردو بھی عوامی زبان ہے اسی میں انھوں نے محبت کے زمزمے گائے ہیں اسی میں انقلاب کے ترانے۔

انقلاب زندہ باد کا نعرہ اردو نے دیا ۱۸۵۷ء میں ان گنت اردو شاعر اور ادیب توپ کے دہانے سے باندھ کر اڑائے گئے جن میں دلی کالج کے استاد مولانا امام بخش صہبائی کا نام سرفہرست ہے نہ جانے کتنے قید و بند کی مصیبتوں کا شکار ہوئے جن میں منیر شکوہ آبادی کا نام سب سے پہلے ذہن میں آتا ہے اردو اخبارات و رسائل کو مشہور فرانسیسی عالم گارساں دتاسی نے انقلاب ۱۸۵۷ء کے لئے ہندوستانیوں کے ذہن کو تیار کرنے کا ذمہ دار قرار دیا ہے آزادی کی جد و جہد میں اردو کے جتنے اخبارات و رسائل ضبط ہوئے اتنے ہندوستان کی کسی دوسری زبان کے نہیں ہوئے ان میں مولانا محمد علی کا ہمدرد مولانا ابوالکلام کا الہلال مولانا حسرت موہانی کا اردوئے معلیٰ لالہ لاجپت رائے کا سوراجیہ اور بندے ماترم مولانا ظفر علی خاں کا زمیندار رسائل تھے مشہور شہید سردار بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کی زبان پر پھانسی کے تختے پر چڑھتے ہوئے بھی جو اشعار تھے وہ اردو کے تھے مشہور انقلابی رام پرساد بسمل خود شاعر تھے۔ اردو کتابیں رسالے اور ڈرامے انقلابی موضوعات پر لکھے گئے اور ضبط ہوئے جن میں کشن چند زیبا کا زخمی پنجاب بہت مشہور ہے سوشلزم کا مفہوم اسی زبان میں سب سے پہلے عام ہوا اردو کے ادیبوں ہی میں ترقی پسند تحریک کی جڑیں سب سے پہلے مضبوط ہوئیں اور سب سے بعد تک رہیں اس زبان اور ادب کی روایت میں رواداری آزاد خیالی اور انسان دوستی کی قدریں موجود رہی ہیں جس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ جدید ہندوستانی زبانوں میں شاید اردو مذہبی ادب سے سب سے زیادہ آزاد رہی ہے ہندی کا اعلیٰ ترین ادب

(بقیہ صفحہ ۸ پر)

ایم۔ اے۔ نصر

میر کے بہتر نشتر

میر کے بہتر نشتر کے بارے میں متضاد رائے ہیں۔ اس باب میں اصحاب رائے نے مکمل خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔ اگر کبھی کسی طرف سے ہلکی سی آواز سنائی بھی دیتی ہے تو اس کا اظہار بیان الجھا ہوا ہوتا ہے، جس کا مقصد الجھی ہوئی گتھی کو سلجھانا نہیں بلکہ گول مول بات کہہ کر محض اپنی جان چھڑانا مقصود ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ میر کے نشتروں نے ایک مسئلہ کی شکل اختیار کر لی ہے۔

وہ بھی ایک ایسا مسئلہ جس میں کوئی الجھنا نہیں چاہتا۔ اگر کوئی اس الجھی ڈور کو سلجھانے کی سعی کرتا بھی ہے تو پرانے تذکرہ نویسوں کے متضاد بیانات کا شکار ہو جاتا ہے اور نتیجہ کے طور پر وہ جن تذکرہ نویسوں سے متاثر ہوتا ہے، ان کے خیال کی مناسبت سے خود بھی اظہار خیال کر دیتا ہے اور اپنی ذاتی رائے کو پیش کرنے سے گھبراتا ہے، اور اپنی اس خامی کو چھپانے کے لئے اپنے سحر طراز قلم سے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیتا ہے کہ لوگ اس کی بھول بھلیوں میں کھو جاتے ہیں اور مصنف کی ذاتی رائے جاننے کا خیال ان کے ذہن سے محو ہو جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ میر تقی میر کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور مختلف انداز سے ان کی زندگی کے مختلف گوشوں اور ان کی حیات و شاعری پر موثر انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے مگر چند باتوں میں قدیم تذکروں کی اندھی تقلید کی گئی ہے اور یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ من و عن ان تذکروں کی تحریر کو سچ مان لیا گیا ہے اور مختلف دو نمایاں ہیں میں ان ہی کے الفاظ کی تائید کی گئی ہے۔ "بہتر نشتر" بھی ان بہت سی غلط لیکن مشہور روایتوں میں سے ایک ہے۔

میر جیسا شاعر جس نے اپنی تمام زندگی کو شاعری کے لئے وقف کر دیا تھا اور شاعری اس کی زندگی کا ایک اہم جزو بن گئی تھی جس پر یہ مقولہ حرف بہ حرف صادق آتا ہے کہ "تصنیف مصنف کی زندگی ہوتی ہے" اور بقول مولوی عبد الحق "جو شخص میر کے حالات اور ان کے اخلاق و سیرت سے واقف نہ ہو، وہ ان کے کلام کو پڑھ کر بغیر کسی تذکرے کی مدد کے خود بخود ان کی طبیعت کی افتاد اور مزاج کو تاڑ جائے گا" اور بقول رام بابو سکسینہ "میر کی زندگی درد و الم کی زندگی ہے" اور سکسینہ نے انگریزی شاعر شیلی کی یہ سطور بھی نقل کی ہیں کہ "حرماں نصیب لوگ غلطی سے گہوارہ ۔۔۔۔ میں ڈال دئے جاتے ہیں جو مصیبت تو خود جھیلتے ہیں مگر وہی مصیبت نظم میں دوسروں کو سناتے ہیں۔"

ایسا شاعر جو اردو غزل کا سرتاج ہو اور جس کی مدح و ستائش میں بقول مترجم ذکر میر نثار احمد فاروقی "ان کی خدائی کے حضور ایسے ایسے سرکشوں نے اپنی 'بندگی' کا اظہار کیا ہے، جن کا مسلک مختلف ہی نہیں بلکہ متضاد ہے۔" ایسے پر عظمت شاعر کے کلام کی عظمت کو صرف بہتر اشعار میں مقید کر دینا کیا صحیح ہو سکتا ہے؟ ممکن ہے میر کے کلام کے بارے میں آزردہ کی یہ رائے صحیح ہو کہ "پستش بغایت پست و بلندش بغایت بلند است" لیکن اس بات سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ میر کے پست کلام تک بھی دوسروں کی رسائی ممکن نہیں ہے۔

اگر میر نے اپنے زمانے کے ماحول سے متاثر ہو کر فارسی کی تقلید کی ہے اور نتیجتاً کچھ پست اشعار کہے ہیں، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کی شاعری میں تصنع زیادہ ہے اور صرف آورد ہی آورد ہے "آمد" کا پتہ ہی نہیں ہے یا دوسرے لفظوں میں یہ کہنا کہ آورد کا غلبہ ہے، صحیح نہیں ہے۔

اس نظریہ کے زیر اثر کوئی رائے قائم کر کے، ان کے اچھے اشعار کی تعداد کو محدود کر دینا، ایک بے معنی سی بات ہے اور میر

عادل جعفری

غزل

کچھ خیریت ادب کی جو منظور دوستو
آپس کی کشمکش تو کرو دور دوستو

لہجہ ہو باوقار متانت لئے ہوئے
بنے نہ جاؤ منت میں مغرور دوستو

تم حدِ قافیہ سے بھی آگے نکل گئے
دیکھیں تو کون کہتا ہے مجبور دوستو

عرضِ ہنر کو چاہئے فنکار کا خلوص
ہو جاؤ گے تم آپ ہی مشہور دوستو

تنخواہ آج دوسرے دن ختم ہو گئی
ہم سے تو اچھے روز کے مزدور دوستو

عادل ہے جو کہنا ہے کھل کر کہے ہیں
ہے ہم کو پاسِ عزتِ جمہور دوستو

کے ساتھ مربوط ہے۔ زندگی ہمیشہ ہوائے سرد و گرم سے متاثر ہوا کرتی ہے۔ ہر آنے والا لمحہ انسانی زندگی میں ایک انقلاب کا باعث بنتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح ادبی زندگی کا بھی حال ہے، یہ بھی ہر دور کے اثرات کو قبول کرتی ہے اور اس پر زمانے کی بدلتی ہوئی گردش کا خاطر خواہ اثر پڑتا ہے اور یہ اپنے ذہن پر ان کے اثرات کو مرتب کرتی ہے اور اسی طرح ہر آنے والا زمانہ ایک نئے اضافہ کا سبب بنتا ہے اور اپنے ماضی و حال کے ان اثرات کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے جو اس کے مزاج کے موافق ہوتے ہیں۔

شاعر بھی انسان ہوتا ہے اور انسانی زندگی کا یہ خاصہ ہے کہ وہ ہوائے سرد و گرم سے متاثر ہوا کرتی ہے اور میر بھی ایک انسان تھے۔ اگر انھوں نے اپنی ڈگر سے ہٹ کر ماحول کا اثر کہیں ساتھ دیا ہے تو یہ انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو بے حسی ہوتی اور کوئی بھی شاعر بے حس نہیں ہوتا — کیونکہ جذبات ہی اس کے قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں، جس کی بدولت وہ بلندی پر پہنچتا ہے "جزویست از پیغمبری" کا لقب پاتا ہے۔

اردو تذکروں میں "آب حیات" کی اہمیت مسلم ہے۔ اس تذکرہ کی کتاب میں میر کے نشتروں کے بارے میں آزاد نے ان الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے کہ "اردو زبان کے جوہری قدیم سے کہتے آئے ہیں کہ ستر اور دو بہتر نشتر باقی میر صاحب کا تبرک ہے" لفظ جوہری اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ آزاد کے پاس اپنے ان الفاظ کی تائید میں کوئی مستند ثبوت نہ تھا بلکہ انھوں نے سنی سنائی باتوں پر نشتروں کی بنیاد رکھی ہے اگر ان کے ذہن میں کوئی ایسی مستند تحریر ہوتی جو ان کے قول (بیان) کی تائید کرتی تو وہ ضرور اس کو نقل کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انشاپردازی کی دھن میں آزاد نے اس باب میں مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے اور ایک غلط بات میر سے متعلق بیان کر دی ہے۔

دراصل یہ ایک محمد حسین آزاد کی رنگین بیانی کی دین ہے۔ آزاد کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ انھوں نے انشاپردازی کو حقیقت پر مقدم رکھا ہے، گویا ان کے یہاں تحریر کے تابع خیال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ایسے فرضی واقعات کو بھی اپنا لیا ہے جو سراسر غلط باتوں ہی پر مشتمل کیوں نہ ہوں۔ بقول شخصے "آزاد کا بیان سو فی صدی حقیقت پر مبنی نہیں ہے" نشتروں کے بارے میں بھی آزاد نے سنی سنائی باتوں کو مد نظر رکھا ہے اور اس کی بنیاد بھی ان ہی غلط مگر مشہور مروجہ باتوں پر رکھی گئی ہے۔

اور آزاد کا پھر یہ کہنا کہ "...... لیکن یہ بہتر کی رقم فرضی ہے کیونکہ جب کوئی تڑپتا ہوا شعر پڑھا جاتا ہے تو ہر سخن شناس سے مبالغہ میں یہی سنا جاتا ہے کہ دیکھیے یہ انھیں بہتر نشتروں میں سے ہے" آزاد کا اس طرح کھلے لفظوں میں بہتر نشتروں سے منسوب روایت کو فرضی گردانا اس بات کا شاہد ہے کہ آزاد خود بھی اپنی اس قول کی سے مطمئن نہیں ہیں اور اسی بے اطمینانی کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے بوکھلا کر ڈھکے چھپے لفظوں میں اپنی غلط بیانی کو تسلیم کر لیا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آزاد نے ایسا کیوں کیا؟ بظاہر تو اس کی کوئی خاص وجہ نظر نہیں آتی ہے مگر ذہن پر ذرا زور ڈالنے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ آزاد کی اس غلط بیانی کا محرک کون ہے؟

یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ آب حیات میں آزاد نے ذوق کو کس قدر بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے، اس کی وجہ ذوق سے ان کا دلی لگاؤ ہے اور ذوق، سودا سے بہت متاثر تھے۔ لہٰذا یہ فطری بات ہے کہ آزاد بھی ان سے متاثر ہوئے۔

میر کے سامنے سودا کی شمع شاعری مدھم تھی، سودا خود کو میدان غزل کا لائق تر شاعر سمجھتے اور ان کے معتقد ان کے خیال کی تائید میں لاکھ سر پٹکیں مگر یہ حقیقت ہے کہ میدان غزل میں میر نے سودا کو مات دیا ہے اور ان کا رتبہ بلند ہے۔ ممکن ہے میر کی گرفت کو کمزور کرنے اور ان کے زور کو گھٹانے اور سودا کو ان کا ہم پلہ بنانے کی جستجو میں آزاد سے ایسی حرکت سرزد ہوئی ہو تو کوئی تعجب نہیں ہے۔

تاریخ ادب اردو کے مصنف کے بقول "ان کے وہ اشعار جو بہتر نشتر کے فرضی نام سے مشہور ہیں سب خود انھیں کے سچے اور دلی جذبات کا پرتو ہیں ...... مگر سچ پوچھیے تو ان کے صدہا ایسے اشعار نکلیں گے جن میں حقیقی شاعری کے اوصاف "بدرجہ احسن موجود ہیں"

ان کے علاوہ بھی بہت سے تذکرہ نویسوں نے ڈھکے چھپے اور صاف لفظوں میں اس کو "فرضی" گردانا ہے اور ان حضرات نے اس بات پر بھی افسوس ظاہر کیا ہے کہ میر کے اچھے اشعار کو اس قدر محدود سمجھنا میر کے ساتھ ناانصافی اور ظلم کرنے کے مترادف ہے۔

پرانے اہل قلم حضرات کے علاوہ ابھرتی ہوئی نئی پود نے بھی اس کی مذمت کی ہے جن میں کمال الدین کمال صاحب کی رائے مجھے بہت پسند آئی ہے یہ نہ صرف کلکتہ کے ایک ہونہار شاعر ہیں بلکہ ایک اچھے تنقید نگار بھی ہیں، بقول ان کے "دریا کو کوزے میں بند کیا جا سکتا ہے سمندر کو نہیں اور میر ایک بیکراں سمندر ہیں" اس باب میں احمد علی جوہر کا یہ خیال ہے کہ "میر کی شاعری ایک ایسے سمندر کی مانند ہے جو اپنے دامن میں خس و خاشاک کو سمیٹے ہوئے بہتی ہے"۔

واقعی میر کی شاعری ایک بیکراں سمندر ہے جو اپنے دامن میں ایک اتھاہ گہرائی رکھتی ہے محض اس سے ابھرتے ہوئے چند بلبلوں کو دیکھ کر اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا دانشمندی سے بعید ہے۔ اگر سمندر کی سی وسعت رکھنے والی شاعری میں کچھ خس و خاشاک آ گئے ہیں تو اس کے لئے شاعر کو سرزنش نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی اس کے فن کو محدود کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی خامیوں کو دیکھ کر اس کے کلام کی خوبیوں کے بارے میں کوئی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ بلکہ کوئی بھی رائے قائم کرتے ہوئے ایک ترازو کے

(باقی صفحہ ۱۴)

مراسلات

غالب کے سلسلے میں مولوی عبدالحق کا ایک مراسلہ

لکھنؤ کے مشہور ماہنامہ "الناظر" کے پرانے پرچے دیکھ رہا تھا کہ اتفاق سے ماہ مئی ۱۹۱۲ء کے شمارے کے ساتھ ایک ضمیمہ نظر پڑا جس میں انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد دکن) کی ایک مختصر سی رپورٹ بابت جنوری، فروری، مارچ ۱۹۱۲ء درج تھی۔ اس رپورٹ سے جہاں اور بہت سی باتیں انجمن کی کارگذاریوں کے بارے میں معلوم ہوتیں وہاں یہ بھی پتا چلا کہ انجمن نے اس زمانے میں یہ ارادہ کیا تھا کہ مرزا غالب کے اردو دیوان کا ایک نہایت نفیس اور صحیح ایڈیشن طبع کیا جائے۔ اس نسخے میں یہ جدت ملحوظ رکھی جائے کہ اردو زبان کے اس وقت کے مشاہیر شعرا اور انشاپردازوں سے مرزا کی شاعری کی بعض خصوصیات پر مضامین لکھوا کر دیوان کے شروع میں لگائے جائیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں متعلقہ حضرات کی خدمت میں جو مراسلہ بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم (آنریری سکریٹری) نے جاری کیا تھا، اس کی نقل ذیل میں درج کرتا ہوں۔ ممکن ہے غالب کی صد سالہ برسی منانے والوں کو اس سے کوئی رہنمائی حاصل ہو سکے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس مراسلے کا حشر کیا ہوا، کس کس نے کیا کچھ لکھا اور وہ کہاں اور کب شائع ہوا؟ مولانا شبلی نعمانی اور خواجہ الطاف حسین حالی تو اسی سال ایک مہینہ اور بارہ دن کے وقفے سے ۱۴ نومبر اور ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو آگے پیچھے اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے انھیں سوچنے کا موقع ہی کہاں ملا ہوگا البتہ باقی اصحاب اس کے بعد دیر تک زندہ رہے لیکن ان میں سے کسی کی توجہ اس کام کی طرف ہوئی ہو، کیا کوئی صاحب اس پر روشنی ڈال سکتے ہیں؟

(محمد عبداللہ قریشی ایڈیٹر ادبی دنیا۔ لاہور)

بابائے اردو کا مراسلہ

جناب مخدومی تسلیم۔

انجمن ترقی اردو نے ارادہ کیا ہے کہ اس مرتبہ اپنی نگرانی میں "دیوان غالب" اردو کا ایک صحیح اور عمدہ نسخہ چھپوا کر شائع کرے۔ جناب کو معلوم ہے کہ غالب کی ہر دلعزیزی اور فلسفیانہ شاعری کی قدر روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور مرحوم کا کلام پسند کرنے والے پہلے کی نسبت کہیں زیادہ ہو گئے ہیں۔ پس بالکل برمحل ہے کہ ایک جماعت کثیر کی خواہش پوری کرنے کا سامان کیا جائے اور پرانے نحو ل کی بجائے، جن میں ناقص کاغذ اور غلط کتابت سے زیادہ کوئی شے نمایاں نہیں، ایک پاکیزہ اور خوبصورت مجلد بازار میں آجائے۔ آج جبکہ طوطا کہانی اور دلفروش ناولٹ تک سفید کاغذ پر چھپ رہے ہیں، باعث حجاب ہونا چاہیے کہ اردو علم ادب کے مایۂ ناز اور انقلاب انگیز شاعر کا مجموعہ اشعار ٹھیائے اور بے نور کاغذ اور پتھر کے گرد آلود کسی میں رہیں ہو۔

لیکن اس عریضے سے محض یہ اطلاع دینا مقصود نہیں اور نہ نیازمند کی رائے میں کسی علمی انجمن کا یہ معمول کچھ زیادہ قابل لحاظ ہے کہ وہ مطبوعہ کتب کے صرف اچھے نسخے چھاپا کرے بلکہ اصل غرض اس تحریر کی یہ ہے کہ جناب سے یہ درخواست کی جائے کہ مرزا غالب مرحوم کی شاعری پر ایک واضح تبصرہ لکھنے کی زحمت گوارا فرمائیں۔

یہ ایسا ان مجالس علمی کی تقلید میں ہے کہ انجمن اساتذۂ ماضیہ پر موجودہ ارباب ذوق سے ان کی رائے لکھوانے کی خواہاں ہے تاکہ اس کے شائع کردہ نسخے میں خصوصیت بھی پیدا ہو جائے اور مستند ادبائے وقت کا مجموعہ آرا اردو علم ادب میں ایک دلکش اضافہ ہو اور اردو شاعری کے طلبہ کو مفید اعانت بھی اس سے مل سکے۔

اس غرض سے میں نے ذیل میں چند عنوانات قائم کیے ہیں اور ہر بحث کے مقابل ان حضرات کے نام درج ہیں جنھیں اس بارے میں زحمت دی گئی ہے۔ جناب کا اسم گرامی بھی اس میں شریک ہے!

۱۔ مرزا صاحب کے خاندانی حالات، تعلقات احباب و اقربا کے ساتھ عوام و خواص کے ساتھ ان کا برتاؤ اور عام گفتار و کردار، نشست و برخاست، معاشرت کا طریقہ۔

(نواب سعید الدین احمد خاں صاحب طالب دہلوی)

۲۔ مرزا صاحب کی شاعری کی خصوصیات ان کی زبان اور طرز بیان کی جدت۔

(۱) مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی نظم لکھنوی۔

(۲) مولوی رضا علی وحشت کلکتہ

۳۔ مرزا صاحب کی اردو شاعری میں فارسی کا امتزاج اور اساتذۂ فارسی سے اس کا تاثر۔

(مولانا شبلی نعمانی)

۴۔ مرزا صاحب کا فلسفۂ شاعری اور اس کا مقابلہ یورپ کے بعض نامور شعرا سے۔

ڈاکٹر محمد اقبال صاحب اقبال۔ لاہور۔

۵۔ مرزا صاحب کی شاعری کا اثر اردو زبان پر۔

(۱) مولانا عبدالحلیم صاحب شرر لکھنوی

(۲) مولوی وحید الدین صاحب سلیم پانی پتی

۶۔ مرزا صاحب کی اردو نثر اور اس کی خصوصیات

(۱) مولانا فضل الحسن صاحب حسرت موہانی

(۲) راقم الحروف عبد الحق

(جناب مولانا حالی کی خدمت میں بھی عرض کیا گیا ہے کہ اگر وہ کچھ تکلیف لکھنے کی فرمائیں تو انجمن کے لئے اس سے بڑھکر قابل رشک کوئی اعزاز نہیں)

مجھے پوری امید ہے کہ میری درخواست پر جناب بالطف ورد توجہ فرمائیں گے اور دو ایک مہینوں میں مطلوبہ تبصرہ ارسال فرماکر انجمن کو بھی احسان مندی کا موقع دیں گے۔ حقیقت میں یہ کام جناب کی معمولی التفات سے نہایت دلچسپ اور ممتاز اور عام پسند ہو سکتا ہے۔ یہ لکھنا شاید غیر ضروری ہے کہ اس تحریر میں مرزا غالب مرحوم کے وہ واقعات زندگی جو پہلے سے عام ہو چکے ہیں دہرانے سے زیادہ کارآمد نہ ہوں گے۔

(عبد الحق آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو)

مرکزی غالب کمیٹی سے

مختلف بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ مرکزی غالب کمیٹی غالب کی صد سالہ برسی پر ۲۵ لاکھ روپے خرچ کرنے کا منصوبہ رکھتی ہے۔ یہ رقم غالب ہال اور غالب کی تصانیف کے ایڈیشنوں پر صرف کی جائے گی۔

مرکزی کمیٹی کے فیصلوں اور خود ہماری زبان کے اداریوں میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ برسی کے سال میں غالب پر کتابیں لکھ کر شائع کی جائیں لیکن ان کتابوں کے لکھنے والوں کو ان کی اشاعت کی کوئی سہولت نہیں دکھائی دیتی۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ مرکزی غالب کمیٹی اس اہم کام کو بھی اپنے فرائض میں شامل کرلے تاکہ ان کتابوں کے مصنف ایک دوسرے عہدہ دوسرا در کھٹکھٹاتے نہ پھریں۔ غالب پر کتابوں کے مسودے طلب کئے جا سکتے ہیں اور ان پر ماہرین غالبیات سے رائے لی جا سکتی ہے، جن کاموں کو قابل قدر سمجھا جائے ان کی اشاعت کمیٹی کی جانب سے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ معیاری مسودے اتنی تھوڑی تعداد میں ہوں گے کہ ان کی اشاعت کمیٹی کے لئے بار نہ ہوگی۔

غالب پر اچھی کتابیں لکھنا بھی اتنا ہی اہم کام ہے جتنا غالب کی تصانیف کو دوبارہ شائع کرنا یا غالب کے نام پر عمارتیں بنانا امید ہے کہ کمیٹی اس مفید کام کے لئے بھی اپنے بجٹ میں کوئی مد قائم کرے گی۔

(گیان چند)

انجمن کی تنظیم - ایک جائزہ

یکم مئی ۱۹۶۸ء کے "ہماری زبان" کے اداریہ میں انجمن کے تازہ فیصلے اور اردو گھر کی تعمیر کی مہم کے عنوان سے جو اداریہ لکھا گیا ہے اس میں ۲۸ اپریل کو انجمن کی ادبی مجلس، مالی مجلس اور مجلس عاملہ اور مجلس عام کے جلسے کے تازہ فیصلوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس وضاحت کے نمبر (۲) میں کہا گیا ہے "اردو تحریک کا جائزہ لینے اور شاخوں کی تنظیم کو بہتر بنانے کے لئے جولائی میں مجلس عام اور ریاستی شاخوں کے نمائندوں کا ایک جلسہ ہوگا جس میں علاوہ دوسرے امور کے ابتدائی منزل سے لے کر اعلیٰ منزل تک اردو کے ذریعے سے تعلیم کا ریاستی شاخوں کے ذریعہ سے انتظام کرنے یا حکومت سے مناسب انتظام کرانے کا پروگرام تیار کیا جائے گا اور اس سلسلے میں کتابوں کی فراہمی اساتذہ کی تربیت اور دوسرے متعلقہ مسائل پر بھی غور ہوگا۔ اس وضاحت میں میرے نزدیک جو باتیں وضاحت طلب (تشریح طلب) ہیں ان کو میں ذیل میں تقسیم کر رہا ہوں۔

(۱) اداریے کے شروع میں ۲۸ اپریل کے جس جلسے کا حوالہ دیا گیا ہے اور اس میں جن شہروں کا نام درج ہے کیا انجمن ترقی اردو (ہند) کی تنظیم انھیں چند شہروں تک محدود ہے۔ ملک کے باقی حصوں میں انجمن ترقی اردو کے نام سے جو انجمنیں کام کر رہی ہیں وہ مرکز سے ملحق نہیں ہیں یا ان کے نمائندے مرکزی انجمن کے جلسوں میں کبھی شرکت ہی نہیں کرتے؟

(۲) جولائی میں جو جلسہ ہونے والا ہے کیا اس میں بھی یہی نمائندے شرکت فرمائیں گے اور پھر ان کے فیصلوں کو پورے ملک کے اردو دوستوں (رعایا یان انجمن ترقی اردو (ہند)) کے فیصلے کہا جائے گا۔

(۳) کیا مجھے بتایا جائے گا کہ ملک کی کتنی ریاستی شاخیں ترمیم شدہ دستور عمل کے مطابق کام کر رہی ہیں؟ انہیں تو مرکز نے اس سلسلے میں کونسا موثر اقدام کیا ہے؟

(۴) کیا جولائی میں ہونے والے جلسے میں ان ریاستی شاخوں کے نمائندے بھی مدعو کئے جائیں گے جن ریاستوں میں باقاعدہ تنظیم نہیں ہے صرف کاغذی شاخیں ہیں؟

(۵) کیا جولائی کے مشترکہ جلسے میں تنظیم کو بہتر بنانے کے اہم ترین سوال پر وہ لوگ غور کریں گے جنھوں نے خود اپنی ریاستوں کی تنظیم کو بہتر بنانے کی آج تک کوئی عملی سعی نہیں فرمائی؟

(۶) اگر انجمن ترقی اردو (ہند) ایک "عوامی ادارہ" ہے اور اس کا "دستور" اردو والوں کے حقوق کا تحفظ کرتا ہے تو پھر اس کو بہتر بنانے کا سوال "عوامی سطح" پر کیوں نہیں حل کیا جاتا؟ جب کہ چند ایک ریاستوں کو چھوڑ کر دوسری ریاستوں کی تنظیم (برائے نام) پر بے عمل شاعروں اور ادیبوں کا قبضہ ہے جو "تنظیم" کے معنی سے تو واقف ہیں مگر یہ آج تک نہیں جان سکے کہ "تنظیم" کس طرح کی جاتی ہے۔ کیا مرکز بے عملوں کی موجودگی میں "تنظیم کو بہتر بنانے" کے صرف خواب ہی دیکھنا چاہتا ہے؟

(۷) ریاستی شاخوں کے ذریعہ اردو ذریعہ تعلیم کا انتظام کرنے کا جو حوالہ دیا گیا ہے کیا مرکز یقین کرتا ہے کہ وہ اپنی کاغذی ریاستی شاخوں کے ذریعہ یہ اہم کام لے سکے گا جب کہ ان میں سے اکثر شاخیں اپنے گھر کی اردو اسکولوں کو بند ہونے سے نہ روک سکیں؟

مجھے امید ہے کہ مرکز کا آرگن ان وضاحت طلب (تشریح طلب) سوالوں کا جواب جولائی کے پہلے عنایت فرما دے گا۔ تاکہ مجوزہ جلسے میں شرکت کرنے والے نمائندوں کا ذہن اس وقت بیدار رہے جس وقت وہ "اردو کی موت و حیات" کے سوال پر غور کرنے بیٹھیں۔

(شفیق انصاری)

مدھیہ پردیش میں غالب کی سویں برسی کی تیاریاں

ہندوستان کے سب سے بڑے صوبہ مدھیہ پردیش میں اردو کے عظیم شاعر و ادیب مرزا غالب کا صد سالہ جشن منانے کی تیاریاں زور شور سے جاری ہیں۔ صوبائی غالب صد سالہ تقریبات کمیٹی کی دعوت پر صوبہ کے مختلف شہروں میں کمیٹیاں قائم کی جا رہی ہیں۔ جن کا الحاق صوبائی کمیٹی سے کرایا جا رہا ہے۔ خود صوبائی کمیٹی میں جو کم از کم سو افراد پر مشتمل ہوگی، ابھی تک صوبہ بھر کے ۵۰ ممتاز دانشور، صحافی، سیاسی و سماجی رہنما، ادبا و شعرا اور دیگر نمایاں شخصیتیں اپنی شمولیت کی منظوری دے چکی ہیں۔ ان میں سے کچھ کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں۔

علامہ محوی صدیقی، شری اے ڈی مانی رکن راجیہ سبھا، نواب صابر علی خاں آف محمد گڑھ، خان شاکر علی خاں ایم ایل اے صدر ایم پی وقف بورڈ، شری پرتاپ کشن ڈائریکٹر آل انڈیا ریڈیو اندور بھوپال، ہندی کے مشہور شاعر ڈاکٹر شیو منگل سنگھ سمن پرنسپل مادھو کالج اجین، وکرم یونیورسٹی میں بورڈ آف اسٹڈیز اردو کے چیرمین ڈاکٹر ابو محمد سحر، ہندی کے مشہور کہانی نویس شرد جوشی، جناب شری بھوپالی مسٹر کے این پردھان ایم ایل اے، شری کالی چرن شکلا منی ایم ایل اے، شری شیام سندر شیام ایم ایل اے، جبل پور یونیورسٹی میں شعبۂ اردو و فارسی کے صدر پروفیسر شیخ فرید، شری کرشنن سکریٹری راجیہ پال مدھیہ پردیش، ڈاکٹر راجندر ورما جوائنٹ ڈائریکٹر کالج ایجوکیشن ایم پی، شری گنگا چرن مصرا چیرمین میونسپل بورڈ کھنڈوا، شری فقیر چند کپور چیرمین میونسپل بورڈ برہان پور، شری دھنا لال شاہ صدر مدھیہ پردیش جرنلسٹ اسوسی ایشن، شری دامیشور گرو سابق منسٹر جبل پور کارپوریشن، شری پنا لال شریواستو سابق میئر جبل پور کارپوریشن، ڈاکٹر خورشید حماد صدر انجمن ترقی اردو کھنڈوہ، حاجی صلاح الدین صدر انجمن ترقی اردو برہان پور، حکیم سید قمر الحسن چیف ایڈیٹر ندیم، مسٹر اے آر رشدی ایڈیٹر افکار، شری کے پی نراشن ایڈیٹر ایم پی کرانیکل، ڈاکٹر رگھوبیر سنگھ پرنسپل ایس ایل جین کالج ودیشہ، شری مدکیار کلکٹر رتلام، مسز اندو وجھا پرنسپل لکشمی بائی گرلس کالج بھوپال۔ ڈاکٹر راجیشور گرو، پرنسپل سائنس کالج رائے پور، ڈاکٹر گوپال ویاس پرنسپل حمیدیہ کالج بھوپال وغیرہ وغیرہ۔

حال ہی میں مسٹر فخر الدین صدر انجمن ترقی اردو مدھیہ پردیش کی صدارت میں غالب صد سالہ تقریبات کمیٹی کی ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا۔ جس میں تقریبات کو منانے کے سلسلے پروگرام پر غور ہوا۔ متعدد تجاویز پیش کی گئیں۔ جن میں یہ تجویز بھی شامل تھی کہ نسخۂ حمیدیہ کا منشرحی ایڈیشن مع ضروری حواشی شائع کیا جائے نیز بھوپال کے ستہا مجددی نے "مطالب غالب" کے نام سے جو شرح لکھی تھی اور جو اب نایاب ہے اسے دوسرے شارحین کی کاوشوں کی روشنی میں ایڈٹ کیا جائے۔ اس کے علاوہ صوبہ بھر میں تقریبات کا ماحول بنانے کے لیے دیدہ زیب ایک بڑا پوسٹر شائع کیا جائے۔ جس میں غالب کا مختصر تعارف اور تصویر ہو۔ اور اسے ہزاروں کی تعداد میں پھیلایا جائے۔ اس کے علاوہ صوبہ بھر میں غالب کے جو شاگرد تھے ان کا ایک تذکرہ اور ہندی انگریزی میں غالب کے شعر و ادب پر ایک کتاب شائع کی جائے۔ اس کے علاوہ عوامی پہلو کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے۔ مشاعرے، سمپوزیم، شام غالب، ڈرامے، تمثیلیں، بیت بازی کے مقابلے وغیرہ کرائے جائیں۔

ابھی تک صوبائی کمیٹی کی دعوت پر کھنڈوا، برہان پور، جبل پور، اندور، نیمچ، منگاؤلی، میں کمیٹیاں قائم ہو چکی ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ ہر مقام پر انجمن ترقی اردو "اسی موقع سے فائدہ اٹھا کر اس زبان کی بقا اور ترقی کے لیے بھی مصروف عمل ہے جس نے غالب جیسا عظیم شاعر پیدا کیا۔" اور کمیٹیوں کی تشکیل میں نمایاں رول ادا کر رہی ہے۔ اسی کی دعوت پر جلسہ بلایا جاتا ہے اور کمیٹی میں ہر مکتب فکر کے نمایاں اور ممتاز شخصیتوں کو شامل کیا جاتا ہے۔

بھوپال شہر کی انجمن ترقی اردو نے اپنے حالیہ جلسہ میں طے کیا کہ صوبائی کمیٹی کو ہر ممکن تعاون دیا جائے اور شہر میں جہاں غالب کے چہیتے شاگردوں کے علاوہ ان کے دیوان کو الہامی کتاب قرار دینے والے ڈاکٹر بجنوری دفن ہیں۔ اس تعلق کی بنا پر شایان شان خراج عقیدت پیش کیا جائے۔ بھوپال شہر کے علاوہ تانتیا ٹوپی نگر اور بی ایچ ای ایل میں بھی کمیٹیاں تشکیل پا چکی ہیں۔

منگاؤلی کی اطلاع ہے کہ وہاں غالب کمیٹی کا جلسہ ہوا جس میں چیرمین میونسپل بورڈ بھی موجود تھے۔ وہاں غالب کی یادگار میں دار المطالعہ قائم کرنے کے بارے میں فیصلہ کیا گیا۔

کھنڈوا اور برہان پور میں وہاں کی انجمنوں کی دعوت پر میٹنگ بلائی گئی اور ہر دو جگہ کی کمیٹیوں کا صدر وہاں کے میونسپل بورڈ کے چیرمین صاحبان کو بنایا گیا۔

گوالیار، رائے پور، رائے گڑھ، رتلام، جاورہ، ریوا، ودیشہ، ساگر اور دوسرے شہروں میں بھی کمیٹیاں تشکیل دی جا رہی ہیں جولائی کے پہلے ہفتہ میں صوبائی کمیٹی کا پہلا اجلاس بلایا جائے گا جس میں پروگرام کو آخری شکل دی جائے گی۔

(آفاق احمد
سکریٹری ایم۔ پی غالب صد سالہ تقریبات کمیٹی بھوپال)

انجمن ترقی اردو ہیرن پور کی خبریں

برہروا میں انجمن ترقی اردو کا قیام

گذشتہ ہفتہ جب جناب کمال الدین صدیقی، اسسٹنٹ سکریٹری بہار ریاستی انجمن ترقی اردو برہروا کے دورے پر آئے تو اردو داں حضرات نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان سے انجمن ترقی اردو کی شاخ برہروا میں بھی قائم کرنے کی گذارش کی انتخاب کے لئے جناب کمال الدین صدیقی پھر کسی تاریخ کو برہروا آئیں گے اور انجمن ترقی اردو کی شاخ کا قیام عمل میں آئے گا۔

ہیرن پور میں یوم پرویز

۱۰ر جون ۶۸ء کو مقامی انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام ہند و پاک کے مشہور شاعر جناب پرویز شاہدی کے انتقال پر ملال پر اظہار رنج کے لئے "یوم پرویز" زیر صدارت جناب مہیش پرشاد منایا گیا۔ بہار ریاستی انجمن ترقی کے اسسٹنٹ سکریٹری و مقامی انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری جناب کمال الدین صدیقی نے جناب پرویز شاہدی مرحوم کی مختصر سوانح کے بعد ان کی اردو خدمات پر روشنی ڈالی اور ان کی وفات کو اردو ادب کے لئے سانحہ عظیم بتایا۔ جناب مظفر امام، رگھونندن جھا راہی، قیوم احمد اور خدا بخش خاں صاحبان نے اپنی تقاریر کے ذریعہ مرحوم پرویز شاہدی کی خدمات پر خراج عقیدت پیش کیا۔

صاحب گنج میں ادبی نشست

صاحب گنج میں ایک ادبی نشست کا انعقاد زیر صدارت جناب کمال الدین صدیقی کاؤنسلر بہار ریاستی انجمن ترقی اردو جناب سریندر موہن کے دولتکدہ پر ہوا۔ جناب کمال الدین صدیقی نے "اندھیرا سایہ" جناب نریندر رمیشر نے "آگ کا دھواں" اور جناب سریندر موہن نے "ہم راہی" عنوانات کے تحت اپنا اپنا افسانہ پیش کیا۔ اس کے بعد جناب کمال الدین صدیقی نے اپنی غزل، جناب رام اوتار آنند نے اپنی ایک ہندی نظم اور جناب اکیلا نے ایک آزاد نظم پیش کی۔

جناب کمال الدین صدیقی کے اعزاز میں جلسہ

مقامی "بزم جمال" انجمن ترقی اردو ہیرن پور کے زیر اہتمام جناب کمال الدین صدیقی کو بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کا نائب سکریٹری مقرر کئے جانے پر ان کے اعزاز میں ایک جلسہ زیر صدارت جناب نند لال بھگت منعقد ہوا۔ جناب ابوالقیس، ابوالخیر، سریندر موہن، مظفر امام، اور مہیش پرشاد مہیش نے جناب کمال الدین صدیقی کو مبارکباد پیش کی جناب کمال الدین صدیقی نے تمام حضرات کا شکریہ ادا کیا۔ (نامہ نگار)

آندھرا میں اردو ذریعہ تعلیم کے بارے میں انجمن کے کارکنوں کا جلسہ

حیدرآباد۔ اردو کے دانشوروں اور انجمن ترقی اردو کے کارکنوں کا ایک جلسہ اردو ہال میں بتاریخ ۳۰ر جون منعقد ہوا۔ جس میں اردو بولنے والے بچے اور بچیوں کے کالجوں میں اردو ذریعہ تعلیم کے مسئلہ پر غور کیا گیا۔ اس جلسہ کی صدارت جناب نواب میر احمد علی خاں صدر انجمن ترقی اردو آندھرا نے فرمائی۔

شرکائے جلسہ نے آندھرا کے کالجوں اور یونیورسٹی میں تلگو ذریعہ تعلیم کے فیصلہ کو سراہتے ہوئے ایڈمنسٹریشن کے اس رویہ کی شدید مخالفت کی کہ اردو بولنے والے بچوں کیلئے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تلگو کے ساتھ اردو ذریعہ تعلیم کے متوازی درجے نہیں قائم کئے جا رہے ہیں۔ اور نہ اردو ذریعہ تعلیم کے جونیر کالج قائم ہو رہے ہیں۔

حالانکہ بڑے وزیر، وزیر تعلیم، تینوں وائس چانسلروں نیز دوسرے متعلقہ افسروں کی میٹنگ میں جو مئی ۱۹۶۷ء میں ہوئی تھی یہ طے ہوا تھا کہ یونیورسٹیوں میں شہروں کے کالجوں میں اور جہاں اردو بولنے والوں کی قابل لحاظ آبادی ہوگی، نیز دوسری لسانی اقلیتوں کے طلبہ کے لیے اردو اور دوسری اقلیتی زبانیں بھی ذریعہ تعلیم ہوں گی اور یہ کہ یہ بچے انگریزی ذریعہ تعلیم کے اسکولوں میں بھی جا سکتے ہیں۔ لیکن یہ جلسہ محسوس کرتا ہے کہ لسانی اقلیتوں کے طلبہ کے ساتھ انگریزی ذریعہ تعلیم کے سلسلہ میں امتیاز نہیں برتا جانا چاہیے۔ اور انھیں خود ان کی زبان میں تعلیم ملنی چاہیے۔

اس سلسلہ میں یہ بات قابل غور ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل اردو ذریعہ تعلیم کے فیصلہ کو نظر انداز کر رہی ہے۔

اس جلسہ میں جونیر کالجوں کے قیام کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا۔ گورنمنٹ تلگو کے جونیر کالج تو قائم کر رہی ہے۔ لیکن لسانی اقلیتوں کے جونیر کالجوں کے قیام کا مسئلہ خود لسانی اقلیتوں پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ چونکہ اردو بولنے والے نہ تو اتنے وسائل رکھتے ہیں کہ وہ خود اپنے کالج قائم کر سکیں اور نہ وہ اتنی کم تعداد میں ہیں کہ گورنمنٹ ان کو نظر انداز کرے نیز ذمہ داری سے بچنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ یہ جلسہ طے کرتا ہے کہ ایک وفد ذیل کی مانگوں کے لیے آندھرا کے بڑے وزیر سے ملے۔

۱۔ آندھرا کی یونیورسٹیوں کو اردو ذریعہ تعلیم کا بندوبست کرنا چاہیے۔

۲۔ جہاں اردو بولنے والے لوگوں کی قابل لحاظ آبادی ہے وہاں اردو جونیر کالج قائم ہونے چاہئیں۔

۳۔ اس سلسلہ میں نصابی کتب اور ٹیچرس کا بھی انتظام ہونا چاہیے۔ (سری نواس لاہوٹی)

باقی صفحہ ۴ سے آگے

مذہبی ہے۔ تلسی داس، سورداس، میرا بائی بھی مذہبی روایات لیے ہوئے ہیں اردو میں ادب کا مزاج رنگین مزاجی اور آزاد روی کا ہے اور غیر مذہبی ہے حتیٰ کہ مذہبی خیالات کو بھی غیر مذہبی روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ لیکن یہ سب باتیں جملہ معترضہ کے طور پر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو کے اپنے کروڑوں بولنے والے شہریوں کے وجود کی وجہ سے ہندوستان کی دوسری جدید زبانوں کی طرح حقوق ہیں اسے مراعات نہیں حقوق چاہئیں ہماری غیر جمہوری پارٹیاں اسے مراعات دینے کو تیار ہیں حقوق دینے میں آنا کانی کرتی ہیں حالانکہ اب معاملہ حقوق ہی کا ہے اور وہ یہ کہ اسے اتر پردیش بہار وغیرہ میں ثانوی سرکاری زبان قرار دیا جائے اس کے معنی یہ ہیں کہ

(الف) اتر پردیش میں بھی بچے اگر چاہیں اور جہاں تک ممکن ہو لازمی طور پر یا اختیاری یا ابتداً اردو پڑھیں اور اس کا انتظام ریاست کی سبھی تعلیم گاہوں میں کیا جائے۔

(ب) سرکاری دفاتر میں جن میں کچہریاں بھی شامل ہیں، اردو کو بھی اختیار کیا جائے یہ اردو بولنے والوں کے بنیادی اور آئینی حقوق ہیں اور انہیں ضرور ملنے چاہئیں۔

یہ حقوق کیوں کر حاصل کئے جائیں؟ اس سلسلے میں اردو بولنے والوں پر دو فرائض عائد ہوتے ہیں ایک ابھی جو جدوجہد جاری ہے اسے آگے بڑھانے کا فرض اور دوسرا تعمیری جدوجہد کو جاری رکھنے کا فرض انجمن نے جو تحریک جاری کی ہے وہ مبارک ہے البتہ اس تحریک کو جمہوری طریقے پر منظم اور ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ یہ فرقہ پرستانہ نہ ہو سکے۔ اس تحریک سے یہ پہچاننے میں بھی مدد ملے گی کہ ہندوستان میں کون کون سی سیاسی جماعتیں اور گروہ ایسے ہیں جو مصلحت سے بے نیاز ہو کر بھی جمہوریت کے صحیح معنوں میں علمبردار کہے جا سکتے ہیں۔

تعمیری جدوجہد کا مسئلہ زیادہ پیچیدہ ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو والے سر جوڑ کر بیٹھیں اور اردو پڑھانے کا ایک مختصر نصاب تیار کریں اس ضمن میں ایک مفید کام حیات اللہ انصاری کی "دس دن میں اردو" کی شکل میں سامنے آ چکا ہے اس پر نظر ثانی کر کے زیادہ موثر بنانے اور اس سلسلے کی دو ایک اور کتابیں مرتب کرنے کی ضرورت ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ ایک ماہ کے عرصے میں بنیادی اردو زبان قواعد اور رسم خط پڑھنے اور لکھنا کام چلانے بھر کا ضرور آ جائے اس کے بعد چھوٹے اسکول ہر قریے اور قصبے میں قائم کرنے کے لئے تنظیمی کام ضروری ہے اردو پڑھنے والے کہاں جائیں گے اور پڑھانے والے کہاں ملیں گے اسباب کیسے فراہم ہو جائیں گے گویا ایک وقتی تعلیم اور تنظیم کے کارکنوں کی ضرورت ہے جو خلوص اور لگن سے اس کام کو شروع کریں گے۔ اور ان سب باتوں سے کہیں زیادہ اہم اور ضروری مسئلہ اردو والوں کے ذہنی رویے کا ہے اگر وہ پست ہمتی اور شکست خوردگی کا شکار رہے تو پھر اردو کو کوئی بچا نہیں سکتا انہیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اردو پچھلے تیس سال کے ناسازگار حالات کے بعد بھی مٹی نہیں ہے ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے اعداد کے مطابق بھی آگے ہی بڑھی ہے اور اس پر پورا اور پکا ایمان رکھنا چاہیے کہ اگر خلوص طور پر اردو کی خدمت کرنے والے موجود ہیں تو اسے کوئی مٹا نہیں سکتا اردو زندہ رہے گی اس کی زندگی کا تعلق براہ راست ہماری جدوجہد سے ہے اردو کی زندگی اور موت در اصل اس پر منحصر ہے کہ ہم جمہوریت کے خلاف چیلنج کو کس حد تک قبول کرتے ہیں ملک میں جمہوریت کا مستقبل (باوجود تمام عارضی دشواریوں کے) شاندار ہے اس لئے اس پر یقین بلکہ ایمان مستحکم ہوتا ہے کہ اردو بھی زندہ رہے گی کیونکہ جمہور اور ان کی زبان کو کوئی نہیں مٹا سکتا۔

(بشکریہ قومی آواز)

صفحہ ۱۲ سے آگے

رسل کے خیالات سے اتفاق ضروری نہیں مگر ان کا مطالعہ ضروری ہے۔ رسل دنیا کے ان مفکروں اور دانشوروں میں ہے جنہیں آدمی سے اور زندگی سے محبت ہے اور وہ جس بات کو سچ سمجھتا ہے اسے بیان کرنے میں کبھی نہیں جھجکتا۔ اس نے اپنے خیالات کے برملا اظہار کی وجہ سے بڑی تکلیفیں اور مصیبتیں جھیلی ہیں۔ مگر وہ اپنی رائے پر قائم رہا۔ ۹۲ سال کی عمر میں وہ جوانوں سے زیادہ مستعدی کے ساتھ ایٹمی جنگ کے خطرے سے دنیا کو آگاہ کرتا رہا ہے۔ ویت نام میں امریکہ کے رول کے خلاف اس نے اپنی جنگ برابر جاری رکھی ہے۔ اس نے ساری دنیا کے افکار پر اپنا اثر چھوڑا ہے۔ زندگی ہی میں اس نے ابدیت کو پا لیا ہے۔

یہ کتاب پڑھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اچانک ایک پہاڑ کی چوٹی پر ہوں اور پہاڑ کی تازہ، روح پرور ہوا میں، کائنات اور اس کے حسن، وادیوں کی شادابی، دریاؤں کے پیچ و خم، آسمان کی نیلاہٹ اور بادل کے ٹکڑوں کی روئی کی سی کیفیت، برف کی دودھ کی سی سفیدی، ہوا سے ہلتے ہوئے چیڑ کے درختوں میں عورت کے جسم کی سی لچک دیکھ رہا ہوں اور اس ایک لمحے میں زندگی کی عظمت اور اس کی ابدیت کھنچ آئی ہے۔

باقی صفحہ ۸ سے آگے

دونوں پر اس کی خوبیوں اور خامیوں کو رکھ کر یہ دیکھنا ہوگا کہ کس کا پلہ بھاری ہے۔

ہمارے ادب کے کرم فرماؤں کو چاہیے کہ وہ اپنی تنقیدی و تحقیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے، حقیقت اور مجاز کو اس طرح الگ کر دیں جیسے دودھ اور پانی ۔۔۔ کیا ہمارے دانشور حضرات میرے بستر نشتر پر روشنی ڈالنے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے!

آل احمد سرور

میرا صفحہ

برٹرینڈ رسل کا شمار اب ان دانش وروں، فلسفیوں اور مصنفوں میں ہوتا ہے جنھوں نے ساری دنیا کو متاثر کیا ہے۔ چھیانوے سال کے اس بوڑھے کی ترکیب معلوم ہوتا ہے پارے اور بیس ہوتی بجلیوں سے ہوئی ہے۔ اس کی تصانیف میں مغربی فلسفے کی تاریخ، مسرت کی فتح، تصوف اور منطق، شادی اور اخلاق، تعلیم اور سماجی نظام، سماج کی تشکیل نو کے اصول، امن کے لئے کون سا راستہ ہے، کیا انسان کا کوئی مستقبل ہے، بہت مشہور ہیں۔ گذشتہ سال اس کی خود نوشت سوانح عمری کی پہلی جلد شائع ہوئی تھی جس میں ۱۸۷۲ سے ۱۹۱۴ تک کی داستان زندگی بیان کی گئی تھی۔ اس کتاب کے شروع میں اس نے لکھا تھا کہ تین چیزیں میری زندگی میں مرکزی حیثیت رکھتی ہیں۔ اوّل محبت دوسرے علم کی پیاس۔ تیسرے مظلوم انسانیت کے لئے بے پناہ درد۔ رسل کی نثر ہیرے کی طرح ترشی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ ذہن میں روشنی بھی کرتی ہے اور ایک ناقابل بیان لطف بھی دیتی ہے۔ کتاب میں زیادہ تر رسل کے خط اپنے دوستوں کے نام اور ان میں کچھ کے جوابات ہیں۔ ان میں افکار بھی ہیں، جذبات کی گرمی بھی اور زندگی کے متعلق گہرا شعور بھی۔ رسل ان فلسفیوں میں سے ہے جو اپنی جرأت فکر اور اپنی نثر کی دل نشینی اور دلپذیری کے لئے مشہور ہے۔ اس کی پہلی جلد کو کچھ لوگوں نے روسو کے اعترافات اور پیپیز (PEPYS) کے ارشادات کے ہم پلّہ قرار دیا ہے۔

حال میں اس کی خود نوشت کی دوسری جلد پڑھنے کا موقع ملا اور مجھے یہ کہنے میں تکلف نہیں کہ ایسی جاندار، مزے دار اور تہ دار کتاب میں نے بہت دن کے بعد دیکھی ہے۔ اس میں ۱۹۱۴ سے لے کر ۱۹۴۴ تک کے حالات ہیں۔ گویا یہاں پہلی جنگ عظیم سے لے کر دوسری جنگ عظیم تک کی رسل کی مصروفیات اور ذہنی و علمی کاوشوں کی مرقع کشی ملتی ہے۔ اس نے کتاب کے شروع میں ہی لکھا ہے کہ "۱۹۱۰ سے پہلے کی میری زندگی اور ۱۹۱۴ کے بعد کی زندگی میں وہی فرق ہے جو فاؤسٹ کے شیطان سے ملنے سے پہلے کی زندگی میں اور اس کے بعد کی زندگی میں ہے۔" پہلی جنگ میں رسل نے بڑی جرأت سے جنگ کے متعلق عام خیالات سے اختلاف کیا اور اس کے صلے میں ۱۹۱۸ میں اسے جیل کی ہوا بھی کھانی پڑی۔ جنگ کے بعد وہ روس گیا مگر وہاں اسے اپنے خوابوں کی جنت نظر نہ آئی اور وہاں سے مایوس لوٹا۔ اس نے کچھ دن چین میں بھی گزارے جہاں اس کی غیر معمولی ذہانت اور علمی صلاحیت کے لوگ معترف تھے۔ وہاں مذہب اور اخلاق کے متعلق اس کے نظریات سے اختلاف شدید ہی تھا۔ امریکہ میں اسے پڑھانے کے لئے بلایا گیا مگر مذہب اور اخلاق کے متعلق نظریات کی وجہ سے کچھ لوگ اتنے خلاف ہو گئے کہ اسے یونیورسٹی چھوڑنی پڑی اور کتابیں لکھ کر اسے کام چلانا پڑا۔ مغربی فلسفے کی تاریخ اسی زمانے میں لکھی گئی اور اس کتاب سے رسل کو خاصی آمدنی ہوئی۔ رسل لکھتا ہے کہ یہ کتاب لکھتے ہوئے مجھے بڑی خوشی ہوئی کیونکہ اس کے نزدیک تاریخ بڑی بھلی ہے اور اسے بیانیہ پر لکھنی چاہئے۔ کچھ ریویو نگاروں نے اسے جانبدارانہ تاریخ کہا ہے مگر رسل کا کہنا ہے کہ اگر کوئی خاص جھکاؤ (BIAS) نہ ہو تو دلچسپ تاریخ لکھی ہی نہیں جا سکتی۔ وہ یہ بھی نہایت صفائی سے کہتا ہے کہ جس شخص کا کوئی خاص جھکاؤ نہیں ہے وہ دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہاں اپنے اس جھکاؤ کو صفائی سے بیان کر دینا چاہئے۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ رسل کو اپنی مغرب کے فلسفے کی تاریخ، مغرب کی حکمت (WISDOM OF THE WEST) سے زیادہ بہتر معلوم ہوتی ہے کیونکہ موخر الذکر کتاب میں اس جھکاؤ یا میلان یا عصبیت کو ہلکا کر دیا گیا ہے۔ سن ۱۹۴۴ تک رسل امریکہ میں رہا۔ پہلی جنگ کی مصروفیات کے مقابلے میں دوسری جنگ کی مصروفیات کا تذکرہ بہت مختصر ہے۔ یوں بھی کتاب میں خطوط کی تعداد زیادہ ہے۔ رسل کا اپنا بیان کم، مگر دلچسپی میں خطوط بھی کم نہیں۔ ان صفحات میں رسل کے علاوہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ، ڈی۔ ایچ۔ لارنس، جے۔ ایم کینس، گلبرٹ مرے، ملانگی، کانریڈ، برنارڈ شا اور بہت سے مصنف، مفکر اور دانش ور بھی چلتے پھرتے اور باتیں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ رسل نے کئی شادیاں کیں۔ خوبصورت اور ذہین عورتوں سے رسل بہت متاثر ہوتا ہے۔ اس کی زندگی میں بہت سی عورتیں آئیں۔ محبت کو وہ محض جسموں کا ملاپ نہیں روحوں کا ملاپ بھی سمجھتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ محبت انسان کو خدا کے قریب پہنچا دیتی ہے۔ اس کے بعض خیالات اتنے دلچسپ ہیں کہ یہاں ان کا آزاد ترجمہ دئے بغیر طبیعت نہیں مانتی۔ اپنے متعلق لکھتا ہے:

"میں نے باری باری سے اپنے کو لبرل، سوشلسٹ یا امن پسند خیال کیا ہے۔ مگر دراصل کسی گہرے مفہوم میں میں ان میں سے کچھ بھی نہیں رہا ہوں۔ ہمیشہ ایک متشککہ ذہن جب میں نے اس کی خاموشی چاہی، سرگوشی میں اپنے شبہات بیان کرتا رہا ہے۔ اس نے مجھے دوسروں کے سستے جوش سے علیحدہ رکھا ہے اور مجھے ایک اجاڑ تنہائی میں پہنچا دیا ہے۔"

"میں انسان کی مسرت کے لئے نہیں جیتا، ہاں اس کی ان چیزوں کے لئے جن میں ذہن کی بلندی ظاہر ہو۔ میرا خیال تھا کہ بیشتر لوگ تمام چیزوں سے زیادہ دولت کو چاہتے ہیں مگر مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ تباہی کو اس سے بھی زیادہ چاہتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ ذہن زیادہ تر صداقت سے وابستہ ہے مگر یہاں بھی مجھے معلوم ہوا کہ دس فیصدی سے زیادہ ایسے لوگ نہیں ہیں جو صداقت کے مقابلے میں مقبولیت کو ترجیح نہ دیتے ہوں۔"

"ہماری نسل پچھلی نسلوں کے مقابلے میں کچھ دیوانی ہے کیونکہ اس نے صداقت کی کچھ جھلکیاں دیکھنا گوارا کیا ہے اور صداقت ایک پرچھائیں ہے، دیوانی ہے اور ہیبت ناک ہے۔ جتنا بھی ہم اس کو دیکھ پاتے ہیں اتنی ہی ہماری ذہنی صحت پر اثر پڑتا ہے۔ وکٹورین عہد کے لوگ معقول اور کامیاب اس لئے تھے کہ وہ صداقت کے پاس کبھی نہ پھٹکے۔ مگر جہاں تک میرا تعلق ہے میں پاگل ہونا پسند کروں گا مگر ایسی مقبولیت سے سروکار نہ رکھوں گا جس میں جھوٹ کی آمیزش ہو۔"

"روایتی رسمی اخلاق کی بنیاد پر ہم مقبول لوگوں سے بے غرضی کی توقع کرتے ہیں، یہ غلطی ہے۔ آدمی ایک جانور ہے جسے اپنی غذا حاصل کرنے اور اپنی نسل کی افزائش سے سروکار ہے۔ ایک طریقہ ان مقاصد میں کامیابی کا یہ ہے کہ آدمی دوسروں کو یقین دلادے کہ اسے ان کا مفاد عزیز ہے، مگر اپنے اور اپنے بچوں کے مفاد کے علاوہ دوسروں کے مفاد کی سوچنا غیر فطری ہے۔ ایک اچھا سماجی نظام لوگوں کو بے غرض بنانے سے وجود میں نہیں آئے گا، بلکہ ان کے حیات بخش جذبات کو دوسروں کے حیات بخش جذبات کے ساتھ ہم آہنگ کرنے سے ممکن ہوگا۔"

(باقی صفحہ ۱۱ کالم ۱ پر)

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، پرنٹر و پبلشر سید ضیاء الحسن نے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھپوایا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کیا